امتحانی مشق نمبر 1

(یونٹ 1 - 4)

سوال نمبر 1 اردو غزل گوئی کی تاریخ میں ولی دکنی کا مقام و مرتبے کا جائزہ لیں۔ (20)

سوال نمبر 2 غالب کی شاعری میں صوفیانہ عناصر کی وضاحت کریں۔ (20)

سوال نمبر 3 داغ دہلوی کے تصورِ حسن و عشق پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔ (20)

سوال نمبر 4 حالی کی قومی شاعری پر مفصل مضمون تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 5 ناصر کاظمی نے میر تقی میر کی یاد تازہ کر دی۔ کیسے وضاحت کریں۔ (20)

ANS 01

ولیؔ کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا. اپنے زمانے کے مشہور اُستاد آزادؔ نے ولی کو "آبِ حیات " میں اردو کا پہلا صاحب دیوان اور شمالی ہندوستان کا پہلا اردو شاعر کہا ہے۔ ایک زمانے تک اس بات کو سچ بھی مانا جاتا رہا مگر جدید تحقیق نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ محمّد قلی قطب شاہ کی کُلیات مل جانے کے بعد ، جو ولیؔ سے تقریباً سو سال پہلے وفات پا چکے تھے، یہ بات غلط ثابت ہوگئی ہے۔

ولیؔ محض تاریخی اہمیت کے حامل نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعرانہ عظمت بھی جواب نہیں رکھتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن میں قادر تھے جیسے شاعری ان کے خاندان میں بہت پہلے سے چلی آرہی ہو۔ انہوں نے غزل، قصیدہ، رباعی، مستزاد، قطعہ اور مثنوی کے علاوہ کچھ ایسی اصناف پر بھی طبع آزمای کی ہے جو آج کل رائج نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ولی کو غزل نے اور غزل کو ولی نے جو شہرت عطا کی وہ دوسری اصناف کے حصّے میں نہیں آ سکی۔

ولیؔ نے اردو غزل کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا اور اسے ایک نیا وقار عطا کیا۔ اس کے علاوہ ولیؔ کا ایک اور ادبی کار نامہ یہ ہے کہ انہوں نے شمال اور جنوب کو شعری روایات کے رشتے میں منسلک کر دیا۔ انہوں نے پہلی بار اردو کو جغرافیائی حدود سے آزاد کر کے اسے سارے ہندوستان میں ادبی ابلاغ و ترسیل کے ایک مؤثر وسیلے کی حیثیت سے روشناس کروایا، اسے ملک گیر اہمیت کا حامل بنا دیا۔ شمالی ہند میں ریختہ کی ساکھ کو بنایا۔ ولی نے اپنے ہم عصر تمام شعراء کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔ غزل پر انہوں نے اتنے گھرے نقش مرتب کیے ہیں کہ انکی حیثیت تاریخی ہو گئی ہے۔

ولی کا کلام بہت مقبول ہوا انکے کلام کی اثر پذیری اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے کلام میں ہندی الفاظ کی گھلاوٹ اور فارسی کی رنگینی و شرینی بھی موجود تھی۔ یہی نہیں بلکہ ولی ہندی شاعری کی روایات سے

بھی کافی متاثر تھے۔ ہندی شاعری کی روایت ہے کہ اظہار محبت عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے، ولی نے اپنی ایک غزل میں عورت ہی سے اظہار محبت کروایا غزل کا مطلع ہے۔

پرت کنھٹا جن نے لی اسے گھر بار کرنا کیا

ہوئی جوگن جوگی پی کے اسے سنسار کرنا ہے

ولیؔ کی غزلوں کی زبان صاف اور شرین ہے۔ گو غزلوں میں خارجی پہلو نمایاں ہے مگر بر جستگی اور کیف کی وجہ سے بیان میں مزہ موجود ہے۔ ان کے کلام میں دل کے سوز و گداز کا اثر ملتا ہے اور زبان سادہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے

مرد کا اعتبار کھوتی ہے

پایا ہے جو کوئی دولت کا فقیر

مشتاق نہیں سکندری کا

ولیؔ کی تشبیہات اور استعارات میں جدّت موجود ہے۔ ولیؔ کے قصیدے بھی خوب ہیں، قصیدے میں جتنی بھی خوبیاں ہونی چاہیے وہ سب ولی کے قصیائد میں موجود ہیں۔ شوکت الفاظ، زور، روانی اور تخیل کی بلندی وغیرہ سب موجود ہیں اور طرّہ یہ ہے کہ مشکل زمین کے ہوتے ہوئے بھی روانی میں فرق نہیں آنے دیا۔ ولیؔ نے اپنی غزلوں میں سیدھی سادھی باتیں پیش کی ہیں جن میں تغزل کے ساتھ ساتھ بعض جگہ اخلاقی مضامین بھی موجود ہیں۔ مضمون آفرینی میں تخیّل کی گہرائی قابلِ داد ہے۔

ہر زبان پر ہے مثل شانہ مدام

ذکر تجھ زلف کی درازی کا

جسے عشق کا تیر کاری لگے

اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

اردو شاعری کا با ضابطہ آغاز ولیؔ دکنی سے ہوتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کے محمّد حسین آزادؔ نے انہیں اردو شاعری کا "بابا آدم" قرار دیا ہے اور انہیں اردو شاعری میں وہی مقام دیا ہے جو انگریزی شاعری میں چاسرؔ اور فارسی شاعری میں رودگیؔ کو حاصل ہے۔

ولیؔ نے نہ صرف دکنی روایت کی پاسداری کی بلکہ امیر خسروؔ کی قائم کردہ ریختہ کی بنیاد پر شعر و سخن کی وہ عالیشان عمارت تیار کی کہ جس نے کلاسیکی اردو شاعری کی بنیاد کو مستحکم کیا اور اس میں آنے والے عہد کے سارے امکانات سمٹ گئے۔ دوسرے الفاظ میں ولیؔ کا کمال یہ ہے انہوں نے اردو غزل کے ساز پر جو نغمے چھیڑے، دنیائے غزل میں ان کی صدائے بازگشت آج تک سنائی دی جا رہی ہے۔

ولیؔ نے زبان و بیان اور شعر ی مزاج کے لحاظ سے اردو شاعری کو وہ معیار اور مرکزیت عطا کی جس نے شمال و جنوب کی شعری روایات کو ایک کر دیا۔ اس ضمن میں جمیل جالبی لکھتے ہیں؛

”ولی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شمالی ہند کی زبان کو دکنی ادب کی طویل روایت سے ملا کر ایک کر دیا ......ولیؔ کی غزل میں اردو غزل کی کم و پیش وہ ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں جو سراجؔ سے لے کر داغؔ تک مختلف شاعروں کی نشانیاں بنی اور جن سے آج تک بزمِ معنی کی شمع روشن ہے “

مجموعی طور پر ولی نے ایک ایسا رنگِ شاعری ایجاد کیا جس پر ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فضا کی خوشبو بھی موجود ہے۔انکی شاعری میں ہند ایرانی کلچر اور روایات کا وہی دلکش امتزاج و مزاج ملتا ہے جس نے ہندوستان میں اردو اور تاج محل کو جنم دیا ہے۔

ANS 02

اردو شاعری اور بالخصوص اردو غزل کا مرکزی موضوع ہمیشہ واردات قلبی کا بیان اور حسن و عشق کے تجربات کا اظہار رہا ہے۔ جہاں عشق ذاتی تجربہ ہے وہاں تاثیر غزل کا لازمی جزو بن گئی ہے لیکن جہاں عشقیہ اشعار روایتی طور پر در آئے ہیں وہاں مشاہدے کی گہرائی اور فن کی پختگی ایسے عناصر ہیں جن کی عدم موجودگی میں غزل کا پیکر بالکل بے جان اور حسن و دلکشی سے عاری نظر آئے گا۔

عشق ہر شخص کا ذاتی تجربہ ہو نہ ہو مگر ہر ذہن میں عشق کا ایک دھندلا یا واضح تصور ضرور موجود ہوتا ہے۔فنون لطیفہ سے متعلق ہر شخص عام آدمی کے بر عکس اس کے اظہار پر بھی قادر ہوتا ہے۔غالب ایک ایسے ہی فنکار ہیں جن کی شاعری میں انسانی جذبات و احساسات اور مختلف حالات میں نفسیاتی رد عمل کا جمالیاتی اظہار پوری فنکارانہ آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

عشق غزل کا سب سے بڑا موضوع ہے۔غالب کے غزل میں عشق کا تصور کیا ہے ؟ اس سوال کے جواب کے لیے جب ہم غالب کے دیوان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں تیسری غزل کے دوسرے شعر ہی میں غالب یوں نغمہ سر ا ملتے ہیں :

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اور پھر جوں جوں آپ ورق پلٹتے جائیں، آپ دیکھیں گے کہ غالب کے نزدیک تو بے عشق عمر کٹ ہی نہیں سکتی۔ وہ اسی عشق خانہ ویراں ساز کو رونق ہستی قرار دیتے ہیں۔وہ عشق کے آلام سے گھبرا کر سو بار بند عشق سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔مگر کہاں ؟ اندوہ عشق کی کشمکش تو جا ہی نہیں سکتی۔ دنیا انہیں کافر قرار دیتی ہے مگر وہ اک بت کافر کا پوجنا نہیں چھوڑتے۔ غالب جب عشق کو انسانی زندگی کے لیے اتنا ضروری قرار دیتے ہیں تو سوال ابھرتا ہے کہ کیا عشق کوئی شعوری کوشش ہے ؟ میر کے والد میر کو عشق اختیار کرنے کی ہدایت

فرماتے۔تو کیا عشق کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے ؟ان تمام سوالات کے جوابات غالب کی غزل میں موجود ہیں۔

غالب کی غزل میں عشق کی سطح بالکل زمینی اور انسانی ہے، مثالی یا ماورائی نہیں۔ان کے نزدیک عشق ایک ایسی آگ ہے جسے اگر ہم لگانا چاہیں تو لگا نہیں سکتے اور اگر بجھانا چاہیں تو ہمارے اختیار میں نہیں۔عشق ایک ایسی کیفیت ہے جس میں خیال کی تمام رعنائیوں کا مرکز و محور صرف ایک شخص ہوتا ہے۔عشق زندگی کے تمام پہلوؤں پر غالب نہیں بلکہ حیات انسانی کا ایک جزو ہے۔یہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی متاثر کرتا ہے اور ان سے اثر قبول بھی کرتا ہے۔اس لیے مختلف حالات میں محبوب کے ساتھ غالب کا تعلق اور محبوب کے رویوں پر ان کا رد عمل مختلف ہوتا ہے۔ کبھی وہ اپنے محبوب کو اپنی گردن پر مشق ناز کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور دو عالم کا خون اپنی گردن پر لینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔کبھی یہ کہہ کر جان صاف بچا لے جاتے ہیں کہ میں زہر کھا تو لوں مگر ملتا ہی نہیں۔کبھی وہ صرف اس بات پر خوش ہو جاتے ہیں کہ وہ پری پیکر ان سے کھلا اور کبھی محبوب کے عمر بھر کے پیمان وفا باندھنے پر بھی راضی نہیں ہوتے کہ عمر بذات خود نا پائیدار ہے۔کبھی وہ محبوب کی بے نیازی کے باوجود ترک وفا پر آمادہ نہیں بلکہ تسلیم کی خو اپنا لیتے ہیں اور کبھی

؎دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

رویوں میں تضاد کی وجہ شاید یہی ہے کہ عشق ساری زندگی نہیں اور زمانے میں محبت کے سوا اور بھی غم ہیں اور یہ آلام عشق کے جذباتی نظام کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

تری وفا سے ہو کیا تسلی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غالب اور ان کے محبوب کے تعلقات میں ایک بات اہم ہے کہ غالب کا محبوب جور و جفا کا پیکر ہی نہیں بلکہ نوازش ہائے بے جا بھی فرماتا ہے۔اگر وہ غالب پر مہربان نہیں تو نامہربان بھی نہیں۔ ضد کی بات اور ہے مگر و ہ سینکڑوں وعدے بھی وفا کر چکا ہے۔غالب ہی اس کے لیے تباہ حال نہیں اس کے چہر ے کا رنگ بھی غالب کو دیکھ کر کھل اٹھتا ہے۔وہ غالب کو اپنی زندگی کہہ کر پکارتا ہے اور غالب کے گھر بھی آتا ہے۔غالب کا محبوب ان کی طرح ہنگامہ آرا ہے۔رسوائی کی نعمت صرف عاشق کی سعی سے حاصل نہیں ہوتی :

؎ہے وصل، ہجر عالمِ تسکین و ضبط میں

معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

غالب کے اشعار میں عشق کا نظام یک طرفہ نہیں۔ خود سپردگی کا وہ عالم نہیں کہ ہر طرح کے جور و جفا کے باوجود شیوہ تسلیم و رضا ہو بلکہ غالب کے ہاں ایک انا اور خود داری ہے۔ اگر محبوب بزم میں بلانے کا تکلف گوارا نہیں کرتا تو سر راہ ملنے پر وہ بھی تیار نہیں۔ اگر محبوب اپنی خو نہیں چھوڑتا تو وہ اپنی وضع بدلنے پر

راضی نہیں۔ وہ محبوب سے سرگرانی کا سبب تک نہیں پوچھتے کہ اس میں سبک سری ہے یہاں تک کہ در کعبہ بھی اگر وا نہ ہو تو الٹے پھر آتے ہیں :

ـبندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب کی وفا جہاں شخصی خصوصیت ہے وہاں ا س بات کا ثبوت بھی کہ غالب کا محبوب غالب سے محبت رکھتا ہے۔ وہ عشق میں خود سپردگی کی بجائے برابری کے خواہش مند ہیں۔وہ جب محبوب مہربان ہو کے بلائے تو ضرور آتے ہیں کیونکہ وہ گیا وقت نہیں کہ پھر آ بھی نہ سکیں۔اور پھر کل تک اُس کا دل مہر و وفا کا باب بھی تھا۔

برابری کی سطح سے مراد ہر گز یہ نہیں کہ جذبہ عشق کی بنیاد کاروباری ذہنیت ہے اور وہ کچھ دے اور کچھ لے پر قائم ہے بلکہ غالب با وفا عاشق ہیں۔ وہ خانہ زاد زلف ہیں اس لیے زنجیروں سے گھبراتے نہیں۔ محبوب کو وہ ایمان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔وہ محبوب کے راز کو رسو ا نہیں کرتے۔وہ محبوب سے تعلق توڑنا نہیں چاہتے۔خواہ عداوت ہی کیوں نہ ہو تعلق قائم رہنا چاہیے۔ بلکہ وفا میں استواری ان کے نزدیک ایمان کی اصل ہے۔

ـوفا داری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ان کے نزدیک عشق اور وفا صرف سر پھوڑنا ہی نہیں اور سر ہی پھوڑنا ہو تو پھر کسی سنگ دل کا سنگ آستاں ہی کیوں ہو۔غالب ہلاک حسرت پابوس ہونے کے باوجود سوتے میں محبوب کے پاؤں کا بوسہ نہیں لیتے کہ ایسی باتوں سے اس کے بدگماں ہو جانے کا خدشہ ہے۔

کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ غالب کا عشق ہوس کا درجہ اختیار کر رہا ہے اور جب عرض و نیاز سے وہ راہ پر نہیں آتا تو وہ ا س کے دامن کو حریفانہ کھینچنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔کبھی کبھی وہ پیش دستی بھی کر دیتے ہیں۔جواباً محبوب بھی دھول دھپا کرنے لگتا ہے۔ لگتا ہے کہ غالب کے ہاں ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب محبوب اس گستاخی اور بے باکی کی اجازت دے دے۔ اور جب یہ اجازت حاصل ہو تو :

ـعجب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب کی غزل میں عشق کی مثلث کے تیسرے زاویے یعنی رقیب کے متعلق اشعار کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ غالب کے ہاں رقیب کے روایتی کردار کے خدوخال کچھ بہت مختلف نہیں مگر رقیبوں کے بارے میں غالب کا رویہ بڑا نرم اور لچک دار ہے۔ برا بھلا کہنے اور اسے کوسنے کی بجائے وہ اسے بھی اپنی ہی طرح کا ایک انسان سمجھتے ہیں۔جس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے۔ اس میں مومن و کافر اور نیک و بد کی تمیز نہیں۔نامہ بر رقیب ہو گیا تو اسے برا بھلا کہنے کی بجائے فرمایا

ـتجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

یعنی اسے سلام بھجوا رہے ہیں۔ اس کے لیے اس نرمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آخر وہ ہمارا نامہ بر رہا ہے۔

ـدیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیے؟
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے؟

بلکہ رقیبوں سے دوستی گانٹھ لیتے ہیں۔اور محبوب کی شکایت میں اسے اپنا ہم زبان بنا لیتے ہیں۔اس طرح دونوں دل کا پھپھولے بھی پھوڑ لیتے ہیں اور محبوب سے شکایت کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔

ـتا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

البتہ محبوب کو اپنی طرف مائل کرنے کے عمل میں وہ رقیبوں کے مقابلے میں سر گرم نظر آتے ہیں۔انہیں بوالہوس کہتے ہیں اور اپنے آپ کو اہل نظر۔

ـہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

عاشق صادق اور بوالہوس میں کیا فرق ہے ؟ محبوب پر واضح کرتے ہیں

فروغِ شعلہ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟

محبوب مہربان ہو تو رقیب بھی گلہ کرتا ہے اور جب محبوب انہیں بتاتا ہے کہ فلاں نے یہ کہا تو محبوب کو مائل بہ کرم رکھنے کے لیے قاطع دلیل دیتے ہیں :

ـکی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

بہرحال رقیب سے وہ اس قدر موافقت پر تیار ہیں کہ محبوب کا اپنا معاملہ ہے

ـتم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ہم کو پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

موافقت کی یہ سطح مومن کے ہاں اتنی بڑھ گئی ہے کہ عشق بازاری نظر آتا ہے

ـلے شب وصلِ غیر بھی کاٹی
تو ہمیں آزمائے گا کب تک؟

غالب کا عشق بازاری نہیں۔ وہ تو عشرت گہ خسرو کی مزدوری کے جرم کی پاداش میں فرہاد کی عشق میں نکو نامی تسلیم ہی نہیں کرتے اور اپنی شاعری میں اس کے لیے جگہ جگہ طنز و استہزا سے کام لیتے ہیں۔

ایک چیز جو غالب کے ہاں غم عشق کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ غم روزگار ہے۔وہ غم دنیا کو غم یار میں شامل نہیں کرتے۔ غم ان کا نصیب ہیں اور غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا۔ محبوب کے خیال سے غافل نہیں مگر رہین ستم ہائے روزگار ضرور ہیں۔ان غم و آلام کی تلافی محبوب کی وفا سے نہیں ہوتی۔اور غم زمانہ نشاط عشق کی ساری مستی جھاڑ دیتا ہے۔

غالب غم زمانہ کو غم عشق کے سامنے لا کھڑا کرنے والا پہلا شخص ہے۔بعد میں اس رجحان نے بڑی قوت حاصل کی۔ عشق بہت کچھ ہے مگر سب کچھ نہیں۔اس لیے غالب کا عشق زمینی اور انسانی ہے مثالی اور ماورائی نہیں۔

عشق کا ایک تقاضا حوصلہ و استقامت بھی ہے۔غالب نہ صرف حوصلہ مندی اور استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ ان کے ہاں ایک طرح کی اذیت پسندی تک کا رجحان ملتا ہے۔محبوب تن عاشق کو مجروح کر کے جانے لگتا ہے تو ان کا دل زخم اور اعضا نمک کا تقاضا کرتے ہیں۔تمنا بے تاب ہے مگر جانتے ہیں کہ عاشقی صبر طلب ہے۔سوز غم چھپانے کی حکمت مشکل ہے۔ انہوں نے دل دیا تو نوا سنج فغاں نہیں ہوئے۔واقعہ سخت ہے اور جان بھی عزیز مگر

؎تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ

وہ تیغ و کفن باندھے محبوب کے پاس جاتے ہیں کہ قتل کرنے میں عذر باقی نہ رہے۔ بیداد عشق سے نہیں ڈرتے ہاں کبھی کبھی سیاست درباں سے ڈر جاتے ہیں۔وہ محبوب کو بار بار دعوت قتل دیتے ہیں۔غرض عشق کے ہر امتحان میں ثابت قدم ہیں۔

غالب عشق میں جان دینے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ان اشعار میں ان کی ظرافت بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے اور اپنی جان صاف بچا لے جانے کا بندوبست بھی کر لیتے ہیں :

؎ہمیں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

؎رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے

ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

؎زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ورنہ

کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

مندرجہ بالا تینوں اشعار میں عشق میں پا مردی پر بھی حرف نہیں آنے دیتے اور جان صاف بچا لے جاتے ہیں۔

غالب کبھی اپنے آپ پر ہنستے ہیں کہ صورت دیکھو جو خوب رویوں پر مر رہے ہو اور کبھی حاصل عشق جز شکست آرزو ہونے پر تاسف کا اظہار بھی کرتے ہیں۔تاہم وہ عشق کی اہمیت و ضرورت سے آگاہ ہیں۔ہر شخص کی طرح ان کی بھی خواہش ہے :

؎قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو

کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

غالب کا عشق ماورائی نہیں زمینی ہے۔ لہٰذا ان کا عشق بھی اسی مرکزی نقطے کے گرد طواف کرتا ہے۔ان کے عشق کا تانا بانا خواہشات کی انہی تاروں سے تیار ہوتا ہے۔غالب کے عشقیہ اشعار پڑھتے ہوئے نہ تو ہمار ا دل گھٹن سے تنگ ہوتا ہے اور نہ مومن و داغ کے عشقیہ اشعار کے مطالعے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نا ہنجار مسرت سے دوچار ہوتا ہے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہم جیسا انسان ہمارے جیسے جذبات ہی کا اظہار کر رہا ہے اور در اصل یہی غالب کی زندہ و محرک قوت ہے جو اسے ہر دور میں زندہ و پائندہ رکھے گی۔

ANS 03

داغؔ فطرتاً شاعر تھے ۔انھیں قدرت کی طرف سے عشق کا جوہرِ لازوال بخشا گیا تھا، یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں مہمات مضامین اور جذبات خود ان کے حالات و واردات کا نتیجہ ہیں ۔ایک تو طبیعت موزوں پائی دوسرے زبان دانی روز مرہ محاورے پر قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ اس وصف کی بنا پر ان کی شہرت دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کا طرزِ سخن اور اسلوب شعر گوئی تمام اہل زبان اور شعرائ میں مقبول و معروف رہا۔ ان کا رنگ ان کے زمانے میں اس قدر مقبول ہوا کہ ہر کس وناکس ان کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کرنے لگا، یہاں تک کہ ان کے سب سے بڑے حریف منشی امیر احمد مینائیؔ نے بھی اپنے دوسرے دیوان میں زیادہ تر داغؔ کا رنگ اختیار کیا۔ داغؔ کے چار دیوان اور ایک مثنوی "فریادِ داغؔ" ان کا ادبی و شعری سرمایہ ہے۔ داغؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق انتخابِ داغؔ کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں کہ

"داغ ؔ زبان کے بادشاہ ہیں اور زبان پر جو قدرت انھیں حاصل تھی وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوسکی۔ علاوہ فصاحت اور سادگی کے ان کے کلام میں شوخی ظرافت اور خاص بانکپن پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام اردو زبان کے محاوروں اور روز مرہ بول چال کا خزانہ ہے۔ محاورے دوسروں نے بھی استعمال کیے ہیں لیکن داغؔ کی طرح بے ساختہ پن کہیں نہیں پایا جاتا ۔"

داغؔ کی شاعری میں دہلی کی تاریخی وتہذیبی اقدار کا بیان ہی نہیں ملتا بلکہ وہ اُس دور کا شہری اور ثقافتی منظر نامہ بھی پیش کرتی ہے ۔ان کی شاعری میں داخلی کیفیات سے زیادہ خارجی واردات کا بیان ملتا ہے ۔ان کی شاعری مجلس و احباب کی شاعری ہے۔ جہاں محبوب کے ساتھ رقیب پر لعن طعن بھی ہے اور محبوب کی دلفریب اداؤں ، اس کی بے وفائیوں اور نازِ دلربائی کا بیان بھی ہے۔ ان کا محبوب روایتی یا خیالی نہیں ہے بلکہ گوشت پوست کا جیتاجاگتا انسان ہے، جو وصل کی لذت سے داغؔ کا دامن بھرتا ہے اور کبھی ناز و نخرے دکھاکر ان کے دل کو تڑپاتا بھی ہے ۔ ان کا محبوب اسی دنیا کا باشندہ ہے ۔جس کی رعنائیوں اور حسن کی دلفریبیوں کو دیکھ کر داغؔ کا دل مچل مچل جاتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں ؂

ہر ادا مستانہ سر سے پائوں تک چھائی ہوئی

اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

چاندسے چہرے پر کیوں ڈالی نقاب

چاند یہ کیسا گہن میں آگیا

داغؔ کا عاشقانہ مزاج خاص موسم کا مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ ہر موسم میں ان پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری رہتی ہے ۔ وہ اپنی نگاہوں کی تسکین کے لیے کسی خوش رو پری جمال ،نازک اندام صورت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں ۔ مثلاً ؎

وہ پھول والوں کا میلہ ،وہ سیر باغ اے داغؔ

وہ روز جھرنوں پہ جمگھٹ پری جمالوں کا

شباب کی رعنائیوں سے بدمستی کی کیفیت میں مبتلا ہو کر ہوس کی تسکین کی تمنا میں وہ حرام و حلال کے چکر میں نہیں پڑتے بلکہ جی کھول کر دادِ عیش دیتے ہیں ۔ لیکن اس طرح کے عشقیہ جذبات کے اظہار میں ان کے یہاں جرأتؔ اوررنگینؔ کی طرح پھکڑپن یا بازاری پن نہیں ملتا بلکہ ایک طرح کا سلیقہ پایاجاتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

عشق بازی کو ہے سلیقہ شرط

یہ گنہ بھی ہے اور ثواب بھی ہے۔

داغؔ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کامحبوب گوشت پوست کا ایک انسان ہے۔ محبوب کے ساتھ داغؔ کا برتائو برابری کا ہے۔ ان کے یہاں آپسی نوک جھونک ،کبھی کبھی تلخی کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے اور یہی تلخی کہیں کہیں طعن و تشنیع کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے،تو کہیں غم و غصہ کے روپ میں مثلاً ؎

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں

تم نہ ہوتے تو دوسرا ہوتا

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا

داغؔ کے کلام میں محبوب سے آپسی چھیڑ چھاڑ کہیں کہیں ۔

داغؔ کا محبوب و مرغوب موضوع، حسن و جوانی اور اس کے لوازمات کا بیان ہے جو ان کے اپنے تجربات کا نتیجہ ہےں ۔ اسی سبب ان کے بیان میں حقیقت اورآفاقیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ عشقیہ معاملا ت کی گلکاریاں،

داغؔ کی زبان میں بلاکی سادگی اور فصاحت کا دریا موجزن ہے۔ بیان کی بے تکلفی کی صناعانہ مہارت جس نے اردو شعروشاعری کو نہ صرف ان کے قلم سے بلکہ ان کے ہزاروں شاگردوں کے ہاتھوں نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ۔ان کے اشعار میں مکالمہ بازی نے دو بدو کی چوٹیں سکھائیں اور شاعری کو تکلفات کی قید سے آزاد کرکے بے تکلفی سے ہمکنار کر دیا۔ انھیں خصوصیات نے ان کی شاعری کو شہرت عام عطا کی۔

داغؔ کی زبان میں بلاکی سادگی اور فصاحت کا دریا موجزن ہے۔ بیان کی بے تکلفی کی صناعانہ مہارت جس نے اردو شعروشاعری کو نہ صرف ان کے قلم سے بلکہ ان کے ہزاروں شاگردوں کے ہاتھوں نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ۔ان کے اشعار میں مکالمہ بازی نے دو بدو کی چوٹیں سکھائیں اور شاعری کو تکلفات کی قید سے آزاد کرکے بے تکلفی

سے ہمکنار کر دیا۔ انھیں خصوصیات نے ان کی شاعری کو شہرت عام عطا کی۔ داغؔ کا کلام تمام تر محاسن سے پُر ہے ؎

دیکھو تو ذرا چشم سخن گو کے اشارے
پھر تم کو یہ دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
;جائو بھی کیا کرو گے مہرو وفا
بارہا آزماکے دیکھ لیا

داغؔ نے زوائد سے اپنے کلام کو پاک رکھا ،یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار رواں زور دار اور مؤثر ہیں ۔ وہ جذبات کا اظہار نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں کرتے ہیں اس لیے ان کے اشعار ہمیشہ دلوں پر تیرو نشتر کا کام کرتے ہیں ۔ ان کے اکثر اشعار میں جرأت کی سی معاملہ بندی اور زندگی کی صفائی ملتی ہے ۔اس پر طرّہ یہ کہ خوبئ محاورہ اور لطفِ زبان نے ان کے اشعار کو دلکش اور پُراثربنادیا ہے۔ ۔

شعرا ئے متاخرین میں داغؔ کا مرتبہ نہایت بلند اور اہم ہے۔ ان کا کلام سننے والے کے دل میں ایک کیفیت پیدا کردیتا ہے ۔جس کو تاثیر سخن کہا جاتا ہے ۔گو وہ آتشؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے ہم پلہ نہ ہوسکے لیکن ان کے شاعرِ خدا داد ہونے میں کوئی شک نہیں ہے ۔جو شعرا ن کی زبان سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ ان کا تمام کلام ان کی طبیعت کے قدرتی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ۔وہ ایک خاص طرز کے مالک ہیں جو ایک حد تک انھیں سے منسوب ہے ۔ داغؔ نے اپنے کلام میں اپنے عشق کی داستانوں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں اور اپنے فریبِ نفس کا پردہ چاک کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغؔ مصلحت پسند اور دور اندیشی سے کوسوں دور تھے ۔ان کی شاعری میں حق گوئی ،حق پسندی پائی جاتی ہے ۔انھوں نے بذاتِ خود عشق میں مبتلا ہو کر اپنی دلی واردات اور کیفیات کو اشعار کا جامع پہنا کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ ان کا عشق حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے۔

داغ نے غلام حسین شکیبا کے صاحبزادے مولوی سید احمد حسین سے فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔اس دور کے مشہور خوش نویس سید امیر پنجہ کش دہلوی سے فن خوش نویسی میں مہارت حاصل کی ۔ قلعہ معلیٰ کے ادبی ماحول اور بہادر شاہ ظفر کی سرپرستی نے داغ کو شعر و شاعری کی طرف مائل کیا ۔ داغ شاعری میں ابراہیم ذوق کے شاگرد ہوئے ۔ قلعہ معلیٰ میں مرزا غالب کا تو آنا جانا تھا اور قلعہ معلیٰ میں آئے دن ادبی مشاعرے ہوا کرتے تھے جس میں بہادر شاہ ظفر موجود رہتے وہ خود بھی اردو کے پر گو شاعر اور نیک دل شہنشاہ تھے۔ اُن کا دربار علماء ، شعراء اور اہل ہنر کا ملجا و ماوا تھا ۔ داغ نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو ہر طرف غالب ، ذؤق ، مومن اور ظفر کی شاعری کی دھوم تھی ۔ قلعہ معلیٰ کے اندر اور باہر ان شعراء کے فکر و فن کا طوطی بول رہا تھا ۔ غالب فلسفیانہ مضامین اور مسائل تصوف کے باب میں بیان کے دریا بہا رہے تھے ۔ استاد ذوق زبان و محاورے کو جلا دینے میں مصروف تھے ۔ داغ نے بھی شعر و شاعری اور ادب میں ایسے جوہر دکھائے ہیں جس کے اجلے نقوش آج بھی نمایاں ہیں۔ داغ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے ۔ اس کے علاوہ

انہوں نے دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ داغ نے اپنے کلام میں اس دور کے حالات کو سمودیا ہے۔ گلزار داغ ، مہتاب داغ اور فریاد داغ ، آپ کی اہم شعری تصانیف ہیں ۔ داغ کی شخصیت اور شاعری کے غالب ، ذوق ، مومن ، صہبائی اور ظفر سبھی مداح تھے اور ان کو ہونہار سمجھتے تھے ۔ بہادر شاہ ظفر اور امام بخش صہبائی پر تو داغ کی شاعری کا جادو چل چکا تھا ۔ دلی کے زینت باڑی محلے میں "ایک طرحی" مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں نامور شعراء شریک تھے جب داغ نے اپنا کلام پیش کیا تو امام بخش صہبائی جھوم اٹھے اور خواب داد دی اور داغ کو گلے لگالیا تھا ۔ داغ نے جو شعر پڑھا تھا وہ اس طرح تھا۔

لگ گئی چپ تجھے ائے داغ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ ال تو کم بخت بنایا ہوتا

احسن مارہروی نے داغ کی شاعرانہ صلاحیتوں کے کچھ واقعات بیان کئے ہیں۔ نواب مصطفی خان شیفتہ کے ہاں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا اور کئی نامور شعراء شریک تھے ۔ داغ نے اپنی غزل سنائی تو سب لوگ حیرت میں پڑگئے ۔ داغ کی غزل کا مطلع اس طرح تھا :

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

مرزا غالبؔ داغ کی شخصیت اور شاعری کے بڑے مداح تھے اور داغ کو ہونہار سمجھتے تھے۔ بقول داغ میں نے مرزا غالب کی مشہور غزل:

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

مرزا غالب بے چین ہوگئے ۔ زانوں پر ہاتھ مار کر بولے "خدا نطر بد سے بچائے صاحبزادے تم نے تو کمال کردیا"۔ داغ ازل سے ہی عشق کا جذبہ اپنے دل میں لیکر پیدا ہوئے تھے ۔ وہ سانس بھی لیتے تھے تو عشق کی چھری ان کے قلب و جگر میں پیوست ہوتی تھی ۔ ان کے ہاں عشق کی بے انتہا شدت ہے ۔ والہانہ جذبات ، لطافت زبان ، نزاکت الفاظ و بیان، محاوروں کا برمحل استعمال ، ترنم اور سوزو گداز داغ کی شاعری کا مخصوص رنگ ہے ۔ داغ نے اپنی شاعری میں عاشقانہ زندگی کی بہترین مرقع کشی کی ہے اور ان کی کہی ہوئی غزلیں اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ اُن کے اشعار میں ترنم ، دلکشی اور سوز و گداز بدرجہ اتم موجود ہے۔ داغ نے غزل جیسی روایتی صنف سخن میں ایک دلکش اور منفرد اسلوب کی بنیاد ڈالی ہے ۔ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود بھی داغ کی شاعری اپنا خاص اثر رکھتی ہے۔

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس والی حیدرآباد (دکن) داغ کی شخصیت اور شاعری کے مداح تھے اور ریاست حیدرآباد (دکن) کے عوام بھی داغ کی شاعری کے شیدائی تھے ۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان آصف جاہ سادس 17 اپریل 1888 ء کو فرمان جاری کیا اور بڑی خواہش سے دا غ کو حیدرآباد (دکن) طلب فرمایا تھا اور داغ حیدرآباد تشریف لائے اور شاہ دکن کی نوازشوں کے مورد ہوئے اور ساڑھے چار سو روپئے ماہوار تنخواہ عطا کی گئی اور تین برس تک یہی ماہوار ملتی رہی اور اس کے بعد ساڑھے پانچ سو روپئے کا اضافہ کرکے ایک ہزار روپئے وظیفہ ماہوار مقرر ہوا جو تاحیات جاری رہا ۔ داغ جس آرام و سکون کے متلاشی تھے 1857 ء کے بعد ان کو رام پور اور حیدرآباد (دکن) میں نصیب ہوا ۔داغ "استاد سلطان" کے باوقار خطاب سے بھی نوازے گئے اور جہان استاد فصیح الملک ناظم یار جنگ دبیر الدولہ جیسے اعلیٰ اعزازات سے بھی سرفراز ہوئے ۔ داغ نے غفران مکان آصف جاہ سادس کی بے انتہا نوازشوں کا ذکر اپنے اس شعر میں کیا ہے ۔

ہے لاکھ لاکھ شکر ائے داغ ان دنوں

آرام سے گزرتی ہے شاہ دکن کے پاس

داغ کا قیام محلہ ، افضل گنج حیدرآباد میں رہا ۔ داغ کی حیدرآباد میں مقبولیت اور شہرت کا راز ان کی خوش اخلاقی ، ملنساری ، خودداری اور ہمدردی ہے ۔ داغ کے حیدرآباد آنے سے پہلے لوگ ان کے نام اور کام سے اچھی طرح واقف تھے ۔ داغ کے آنے سے قبل ہی ان کا شعری دیوان "گلزار داغ" حیدرآباد پہنچ چکا تھا اور "دال منڈی" کے ناٹک جو حیدرآباد میں پہلی بار قائم ہوئی تھی ، داغ کی غزلیں گائی جاتی تھیں اور لوگ بڑے ہی اشتیاق سے ان کی غزلیں سنتے تھے اور اکثر لوگ ان سے خط و کتابت کے ذریعہ شاگرد ہوچکے تھے ۔ داغ کے حیدرآباد آتے ہی ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوگیا ۔ ارباب اقتدار مہاراجہ چندولال شاداب ، مہاراجہ کشن پرشاد شاد اور دوسرے امراء داغ کی شخصیت اور شاعری کے بڑے مداح تھے اور شاہ دکن آصف جاہ سادس پر تو داغ کی شاعری کا جادو چل چکا تھا ۔ داغ نہایت شریف النفس اور نیک دل انسان تھے ۔ انہوں نے زندگی میں کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ کسی کے کلام پر اعتراض کیا اور نہ کسی معترض کو جواب دیا اور نہ کسی سازشوں میں ملوث رہے ۔ داغ کے امیروں ، رئیسوں اور ارباب اقتدار سے گہرے مراسم تھے اور وہ ہر سبھی سے ملتے تھے مگر وہ غریبوں سے بھی اکڑتے نہ تھے۔ یہ تھا شائستہ تہذیبی ورثہ جس کے داغ تنہا وارث تھے ۔ شاعری میں والہانہ جذبات ، لطافت زبان ، نزاکت الفاظ و بیان ، محاوروں کا بر محل استعمال ، ترنم اور سوز و گداز داغ کا مخصوص رنگ ہے ۔ داغ نے اپنی شاعری میں عاشقانہ زندگی کی بہترین مرکشی کی ہے ۔شاعر مشرق علامہ اقبال جو اردو زبان و ادب کے مشہور شاعر و مفکر گزرے ہیں، انہیں داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا ۔ وہ داغ کی شخصیت اور شاعری کے بڑے مداح تھے ۔ حضرت امیر مینائی جو 5 ستمبر 1900 ء کو حیدرآباد تشریف لائے اور حیدرآباد آکر اپنے دیرینہ رفیق داغ کے مہمان ہوئے لیکن قضا و قدر نے انہیں یہاں زیادہ عرصہ قیام کی اجازت نہیں دی اور 13 اکتوبر 1900 ء

کو آپ نے انتقال فرمایا اور آپ کی آخری آرام گاہ حیدرآباد میں ہے ۔ داغ نے اپنے دیرینہ احباب کی مفارقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس طرح فرمایا تھا ۔

داغ اس ضعف نے کی اپنی تو منزل کھوئی

ہم رہے جاتے ہیں سب یار چلے جاتے ہیں

1891 ء میں داغ نے اپنی رفیقہ حیات فاطمہ بیگم کو حیدرآباد بلوالیا تھا جو یہاں (7) سال اور چند ماہ کے قیام کے بعد 1898 ء میں انتقال فرمائیں جس کا داغ کو گہرا صدمہ ہوا ۔ اس کے بعد داغ کی طبیعت آہستہ آہستہ ان کا ساتھ چھوڑنے لگی اور داغ بیمار رہنے لگے ۔ "دبدبہ آصفی" 6 ذی الحجہ 1322 ھ میں داغ کے مرض الموت کی تفصیل شائع ہوئی تھی ۔ مہتمم لکھتے ہیں کہ داغ آٹھ دن تک بستر علالت پر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ بائیں جانب فالج کے حملے کی وجہ سے جسم کا ایک حصہ بے حس ہوگیا تھا ۔ عبدالمجید آزاد کا بیان نور اللہ محمد نوری نے اس طرح نقل کیا ہے کہ "داغ کو آخری زمانہ حیات میں اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی اور انہوں نے آزاد سے کہا تھا کہ اب مجھے عطر کی بو محسوس نہیں ہوتی ، گانا سنوں تو وحشت ہونے لگتی ہے ۔ غزل کہنے اور سننے سے طبیعت دور بھاگتی ہے ۔ یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ اب میری زندگی کے دن ختم ہوچکے ہیں"۔

ہوش و حواس تاب و تواں داغ جاچکے

اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

ANS 04

حالی ؔ کے مسدس نے اردو میں قومی شاعری کی بنیاد ڈالی۔مسدس لکھے جانے کی تہذیبی و سماجی وجوہات بھی تھیں۔ 1857ء کے حالات کے بعد مسلمانوں کو ایک طرح سے زوال آگیا تھا۔ مغلیہ سلطنت اورجاگیر داری نظام کے خاتمے کے بعد بے ہنر مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے سامنے معاشی بدحالی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دین سے دوری اور بے جا رسم و رواج میں پھنسے مسلمانوں کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جس جگہ تاریکی ہوو ہیں سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ خواب غفلت میں ڈوبی قوم کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے ایک مسیحا کے روپ میں سرسید احمد خاں ہندوستان کی تہذیبی و سماجی زندگی کے افق پر ایک روشن ستارے کی مانند ابھرے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے حصول میں مضمر ہے اور یہ کہ اس قوم کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ انہوں نے حالی ؔ ‘شبلیؔ ‘نذیر احمد‘ آزاد اور دیگر رفقاء کے ساتھ ایک سماجی تحریک شروع کی جسے اردو ادب کی تاریخ میں علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے۔ سرسید چاہتے تھے کہ قوم کو جھنجھوڑنے کے لئے کوئی ایسی شاہکار نظم لکھی جائے جس میں مسلمانوں کا شاندار ماضی بھی دکھایا جائے اور موجودہ پستی کے ساتھ مستقبل کی راہ بھی دکھائی جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ حالی ؔ پرانی شاعری سے بیزار تھے اور اردو میں نظم نگاری کے تجربے کر رہے تھے چنانچہ انہوں نے حالی ؔ سے مسدس لکھنے کی فرمائش کی۔حالی ؔ

بھی پرانی غزلیہ شاعری سے بیزار تھے اور ادب کی مقصدیت کے لئے کام کر رہے تھے ۔ حالیؔ اپنی کیفیت کے بارے میں مسدس میں لکھتے ہیں:

زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہوگیا تھا۔ اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے ابھاروں سے دل بڑھتا تھا نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا۔ مگر کہ ایک ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔اس لئے بخارات درونی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔ قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے جو اپنی قوم کے سواتمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا تھا اور جس طرح خود اپنے پرزور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا تھا اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام پر لگانا چاہتا تھا آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعوی کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے--- ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا ۔ مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل سے ہی نکلی تھی دل میں جاکر ٹھری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبعیت میں ایک ولولہ پیدا ہوا ۔ باسی کڑی میں ابال آیا۔ افسردہ دل بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواترحملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے انہیں سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ (الطاف حسین حالی۔ مسدس مدوجزر اسلام۔ص۔۳۔۴)

ان خیالات کے ساتھ حالیؔ نے سرسید کی فرمائش پر لبیک کہا اور یہ شہرہ آفاق نظم” مسدس مدوجزر اسلام “ لکھی۔ جس پر سب سے اہم تاریخی تبصرہ سرسید نے کیا جب کہ انہوں نے مسدس دیکھ کر کہا کہ” اگر خدا نے مجھ سے پوچھا کہ دنیا سے کیا لائے ہوتو، میں کہہ دوں گا کہ حالی سے مُسدّس لکھوالایا ہوں۔“مسدس کی اس سے اچھی تعریف اور کسی نے نہیں کی۔حالیؔ نے یہ نظم لکھنے کے لئے مسدس کا فارم استعمال کیا۔ مسدّس چھ مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں، اس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ اس کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اورآخری شعر کسی اور قافیہ میں آتا ہے۔ مسلسل واقعات، یعنی قومی، سیاسی اور اخلاقی موضوعات کی ادائیگی کے لیے مسدّس نہایت موزوں صنف ہے۔اس میں روانی ہوتی ہے اور اثر انگیزی بھی۔ اردو میں اگرچہ مسدّس کسی الگ صنف سخن کی حیثیت نہیں رکھتی، تاہم یہ اردو شاعری کا اہم جز ہے، عربی اور فارسی شاعری میں مسدّس کاوجود نہیں ہے۔ لیکن اردو میں حالیؔ کا مدوجزر اسلام اور علامہ اقبال کا شکوہ وجواب شکوہ چونکہ اس طرز میں لکھا گیا ہے، لہٰذا نظم کی اس صورت کو کافی اہمیت حاصل ہوچکی ہے۔اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں کربلا اور اہلِ بیت کے واقعات کے اظہار کا بہترین ذریعہ مُسدّس سمجھا جاتا تھا۔ اس طرز میں غم والم کی داستانیں سُنا سُنا کر لوگوں کو رُلایا جاتا تھا؛ چونکہ حالیؔ ہی حقیقتاً قوم کا مرثیہ بھی لکھ رہے تھے، لہٰذا انھوں نے مُسدّس کو اس مقصد کے لیے موزوں ترین صنف تصوّر کیا اور اسی کو اپنایا۔ اس وقت مثنوی محض رزم وحزن کے واقعات کے لیے مخصوص ہوچکی تھی، لہٰذا ممکن نہ تھا کہ اس کے ایک ایک شعر میں تاریخ کے علاحدہ واقعات کا ذکر کیا جاتا۔ اس لئے بھی حالی نے مُسدّس کو اپنایا، اس کے ہربند میں الگ الگ واقعات کے تذکرہ کی گنجائش تھی،اس

میں تمام واقعات سامع پر کھل کر سامنے آجاتے ہیں، جس سے ہرقاری صحیح نتیجہ اخذ کرسکتا ہے۔

حالی ؔ کی مسدس کی مقبولیت کی ایک وجہہ بھی اس کا فارم ہے کہ ایک ایک بند میں بات بیان کی جائے اور بند کے آخری دو مصرعوں میں بات کو انجام تک پہونچایا جائے۔مسدس کو اردو کی پہلی طویل قومی نظم کہا گیا۔اس نظم میں حالیؔ نے مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی اور علمی زندگی کا ارتقا دکھایا، ظہور اسلام اور مسلمانوں کے زوال کی کہانی پیش کی۔ نظم کا مقصد ایک طرح سے قومی بیداری اور اس ناقابل تلافی نقصان کا ازالہ کرنا مقصود تھا، جو معاشی اور اخلاقی تنزّل کی وجہ سے ظہور میناآ یا ہے، اس کے لیے شاعر نے ان تمام عیوب اور کمزوریوں کو انتہائی موثر اور درد انگیز طریقہ سے بیان کیا ہے۔ اس کا مقصد احساس زیاں کو بیدار کرنا تھا اور مسلمانوں کی پستی کا علاج بھی۔ خود حالی نے مسدس کا اجمالی تعارف بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

’’اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے طور پر لکھ کر عرب کی ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے، جو ظہورِ اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا تھا، پھر کوکب اسلام کا ظہور ہونا اور نبی اُمّی کی تعلیم سے اس ریگستان کا سرسبز وشاداب ہوجانا اوراس ابررحمت کا ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی ودنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزّل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہوگئے۔‘‘ (الطاف حسین حالی۔ مسدس مدوجزر اسلام۔ص۔۳۔۴)

مسدس کا آغاز اس رباعی سے ہوتا ہے

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے (مسدس ۔ ص۔۱)

مسدس میں خیالات کی روانی ہے اور د لسو ز انداز میں بات کہی گئی ہے۔ مسلمانوں کی پستی کو بیان کرتے ہوئے حالیؔ کہتے ہیں:

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے
گماں ہے یہ ہردم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

عرب کی جہالت اور پستی بیان کرنے کے بعد حالیؔ نے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وصلم کی بعثت

مبارکہ اور آپ ﷺ کی جانب سے لائی گئی اسلام کی روشنی کو بیان کیا۔

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا

حقیقت کا گر ان کو ایک اک بتایا

زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا

بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا

کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر

وہ دکھلا دئے ایک پردہ اٹھا کر (مسدس ـص ٢٠)

مسدس میں آپ ﷺ کی شان میں کہے گئے وہ نعتیہ اشعار بھی ہیں جو اکثر محافل نعت میں پڑھے جاتے ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ

یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ (مسدس ـص٢٢)

ہندوستانیوں کی پستی کا حال بیان کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں:

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم

نہ درباریوں میں سرفراز ہیں ہم

نہ علموں میں شایان اعزاز ہیں ہم

نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم

نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں

نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

ANS 05

ناصر کی شاعری میں رات کا ذکر بہت زیادہ ہے اور یہ رات کی علامت اِس کے اندر موجود اُداسی اور ایک گہری خامشی کی غمازی بھی کرتی ہے۔ ڈاکٹر نیئر صمدانی لکھتے ہیں کہ ناصر خود اپنے بارے میں کہتا ہے کہ:

’’اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے اس کی وجہ اندھیری رات نہیں ہے۔ یا وہ جسے ہمارے جدید شعرا ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی علامت ہے دنیا کی ہر چیز رات کو تخلیق ہوتی ہے۔‘‘

کپڑے بدل کر بال بنا کہاں چلے ہو کس کے لیے

رات بہت کالی ہے ناصر گھر میں رہو تو بہتر ہے

۱۹۴۷ء کے بعد کی شاعری میں ماضی کی بازگشت نمایاں ہو جاتی ہے اور ناصر کی یاد کے گلاب پوری طرح کھل اُٹھتے ہیں۔

''ناصر ان رونقوں کو یاد کرتا ہے اور اِن لوگوں کو یاد کرتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنے دل کی تار ملاتا تھا۔''

ناصر نے ہجرت کے دوران جو تباہی و بربادی دیکھی جو ظلم و ستم اپنوں پر ہوئے دکھایا اس پر اس نے غزلوں میں نوحے رقم کیے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی غزلوں میں اس کی پہلی غزل اس کا نوحہ ہی تو ہے:

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

سہیل احمد بتاتے ہیں ناصر نے ان نوحوں کے متعلق ایک دفعہ ٹی ہاؤس میں احمد مشتاق کا یہ شعر پڑھا تھا:

خالی شاخیں بلا رہی ہیں
پھولو آؤ کہاں کھلتے ہو

یہاں پر ناصر نے واضح کر دیا کہ یہ نوحہ ایسی ماؤں کاہے جن کے پھول غدر میں اپنوں سے جدا ہو گئے ہیں مگر اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس کا کوئی مفہوم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے کئی ایک مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے بارے میں سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں کہ:

''ناصر کاظمی کی شعری سلطنت مختلف منطقوں میں نئی ہوتی ہے۔ اس کی سلطنت کا نقشہ سجے ہوئے شہروں، ٹھٹھری ہوئی راتوں، سونے راستوں، دھکے کنکروں، کانٹوں اور بے چراغ گلیوں، جلی ہوئی کھیتیوں، بدیسی جھیلوں، بجھے دنوں کے ڈھیروں، خاموشیوں کے قفل، دھوپ کے سائبان، زخم و گفا آتش خاموشی سے قریب ہوتا ہے۔''

ناصر کاظمی نے بہت سے موضوعات پر شاعری کی۔ ان کی شاعری میں وہ لہجہ اور وہ اندازِ بیاں موجود ہے جسے ہندوستان اور پاکستان کے لوگ دل سے محسوس کر سکتے ہیں۔ حمیر ہاشمی لکھتے ہیں:

''ناصر کاظمی کا نظر سے زیادہ زمین کے ساتھ گہرا رشتہ تھا اس زمین کے توسط سے اس کی پرندوں، درختوں، پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں، دریاؤں، نالوں اور ہر شے سے قربت تھی جس کے بدن سے اِس کو اپنی مٹی کی خوشبوآتی تھی ان کی تمام شاعری خوشبو کی بازیافت کا نام ہے۔''

ناصر کی زندگی میں ہجرت کی وجہ سے بے شک بہت بڑا یادوں کا سیلاب آنا ہے لیکن اِس کے باوجود یہ جمود پرست شاعر نہیں ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد زندگی کی تیز طرار موجوں کے ساتھ جینا سیکھ لیتا ہے۔

''ناصر نے اپنے باطن سے ظاہر کی طرف اور ظاہر سے باطن کی طرف لاہور شہر میں ایک بستی بسائی۔''

ناصر نے اپنے دل میں آرزوؤں اور حسرتوں کے قافلوں کو قیام کے لیے جگہ بخشی اور لاہور کو ''شہرِ طرب'' کی خلعت بخشی۔

ایک شام وہ پاک ٹی ہاؤسمیں ایک غزل لکھ کر لایا جس نے تمام لاہوریوں کا دل جیت لیا۔ وہ غزل کیا تھی؟ وہ تو آزادی کی تگ و دو اور اضطراب سے نڈھال قوم کے لیے ایک نفسیاتی لوری تھی۔

دن ڈھلا رات پھر آگئی سو رہو
منزلوں پہ چھا گئی خامشی سو رہو سو رہو
سارا دن تپتے ہوئے سورج کی گرمی میں جلتے رہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھر چلی سو رہو سو رہو

یہ مسلسل غزل ایک عجیب اور اجنبی روپ میں نظر آتی ہے۔ یہ دن کی دوڑ دھوپ سے رات تک سکون اور راحت کی طرف ہجرت کا اشارہ تھی۔ وہ رات اور وہ بات جو ہمارے جسم اور وجود میں مستور ہوتی ہے ناصر نے اس میں ہمارے نفس اور وجود میں چھپی رات کو اُجاگر کیا ہے۔

۱۹۵۲ء۔۱۹۵۳ء کا دور ناصر کاظمی کی شاعری میں نئی مہکاروں کا زمانہ ہے۔ اِس دور میں یاد، اداسی، تنہائی کی وہ شدت نہیں جو اس سے پہلے تھی۔ البتہ اِس دور میں ''چاند اور دھیان'' کے استعارے اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔

دل تو میرا اُداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

چاند اور دھیان دو ایسے لفظ ہیں جو بہت کثرت سے آتے ہیں ہر مرتبہ معنی بدل بدل کر استعمال کیے جاتے ہیں۔ چاند کو دیکھ کر تو ناصر پر دیوانگی چھا جاتی ہے۔

شام سے سورج رہا ہوں ناصرؔ
چاند کس شہر میں اُترا ہو گا

شہر اُجڑے تو کیا ہے کشادہ زمینِ خدا
اِک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

اس غزل میں ناصر نے پرانی قدروں کو پھر سے تہذیب کا حصہ بنانے کی ٹھان لی ہے اور عوام الناس کو پچھلے ظلم و ستم کو بھلا کر صبر کا درس دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ اگلی منزلوں کے راستے ہموار کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

ناصر نے خود بھی اپنی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ اگر ہم عطر کی شیشی کھولیں تو خوشبو تو آئے گی، مگر پھول یا باغ نظر نہیں آئیں گے، اسی طرح ناصر کی شاعری عطر کی شیشی کی سی ہے۔ ان کی تمثالوں اور

اشاروں سے ہمیں اپنے عہد کی خوشبو آتی ہے۔ ناصر کی شاعری موجودہ نہیں بلکہ آنے والے دور کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی بڑی ہے ابھی

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصرؔ
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

اس قدر رویا ہوں تیری یاد میں
آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے

سوکھے پتوں کو دیکھ کر ناصرؔ
یاد آئی ہے گل کی باس بہت

روتے روتے کون ہنسا تھا
بارش میں سورج نکلا تھا

ناصر نے سبز مرگ پر انتظار حسین کو جو غزل سنائی وہ ناصر کاظمی کی زندگی کا المیہ ہے۔

وہ ساحلوں پر گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

یہ غزل ناصر نے ۳۰، اپریل ۱۹۷۱ء میں اے وی ایچ میں بیماری کے دوران میں کہی تھی۔ اس پر آفتاب احمد کہتے ہیں:

’’یوں محسوس ہوتا ہے کہ اِس غزل میں ناصر نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ساری عمر کہنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس میں زندگی سے مایوسی بھی ہے اور زندگی کی حسرت بھی اور تمنا بھی۔ رات کی تاریکی اور صبح کا انتظار بھی جو اپنے ساتھ نئے قافلے لانے والی تھی۔‘‘

اس سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ناصر کا نوحہ ہے کیونکہ ناصر کی زندگی میں ہجرت کے الم ناک مناظر کبھی کبھی اوجھل نہیں رہے۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی کسک ناصر نے خود اپنے وجود میں سرکتی، اچھلتی، مچلتی دیکھی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کہتے ہیں:

"ناصر کا سفر شہروں کے اُجڑے قافلوں کے لٹے اور اُڑتی ہوئی خاک کے درمیان شروع ہوا تھا اور ساحلوں پر گانے والوں اور کشتیاں چلانے والوں کے گم ہونے پر ختم ہوا۔"

ناصر کاظمی کے کلام میں جہاں اس کے ذاتی دکھوں کی کہانیاں ماضی کی زندگی کی یادیں پرانی اور نئی بستیوں کا حال بھی رونقیں، ایک بستی کے بچھڑنے کا غم اور دوسری بستی بسانے کی حسرت تعمیر ملتی ہے وہاں وہ اپنے عہد اور اس میں زندگی بسر کرنے کے تقاضوں سے بھی غافل نہیں۔ اپنے کلام میں ان کا عہد بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رخسار بھی

یہ عمر ناصر کی پختگی کی عمر تھی اور شاعری میں اس کا رنگ نظر بھی آتا تھا۔ ناصر نے برگِ نے میں صحیح ہی تو کہا ہے:

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفل سخن میں
ہر دور کو غزل میں میرا نشان ملے گا

یہ دعویٰ ایک ایسا ہی شاعر کر سکتا ہے جس نے غزل کو نئی زندگی سے ہمکنار کیا۔ اس دور میں غزل کا پرچم بلند کیا۔ جب ہر جگہ نظم کا پرچم لہرا رہا تھا۔

"غزل کا یہ ہرا بھرا درخت ماضی کی سرزمین میں جڑیں پیوست کیے ہوئے ہے اور حال اور مستقبل میں اپنی شاخوں کے بازوؤں کو لہرائے ہوئے آنے والے وقت کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔"